Fikr-o-Nasar (Islamabad) 24:1 (1986)
© rasailojaraid.com

اجارہ قرآن و حدیث کی روشنی میں

(جواب تبصرہ)

محمد طاسین

سہ ماہی مجلہ فکرونظر کے شمارہ جنوری ۔ مارچ ۱۹۸۶ ء میں جناب محمد اکرم خان کا جو مضمون میرے اس مقالہ پر تبصرہ کے عنوان سے شائع ہوا ہے جو فکرونظر کے شمارہ اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۸۵ء میں ,, اجارہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ،، کے عنوان سے شائع ہوا تھا ، اس پر کچھ اظہار خیال سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک ایسے مضمون و مقالے پر جو کسی اہم معاملے و مسئلے سے متعلق، اسلام کے حوالہ سے لکھا گیا اور جس کے اندر عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی نئی بات کہی گئی ہو اور وہ بات غیر معمولی اور دور رس نتائج کی حامل ہو ، خواہ اس مقالے و مضمون کا لکھنے والا کوئی بھی کیوں نہ ہو ، اس کے متعلق دوسرے اصحاب علم و فہم اور ارباب فکرونظر کی طرف سے مخالف موافق تحریریں سامنے آنا، بہت ضروری ہے تاکہ اگر وہ مضمون و مقالہ غلط اور گمراہ کن ہے تو اس کی تردید کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کو اس کے برے اثرات سے بچایا جائے اور اگر صحیح و صواب ہے تو اس کی تائید کرکے اسلام اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جائے، پھر چونکہ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ جب ایک مسئلہ پر متعدد اہل علم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرات بحث و مباحثه کرتے ہیں تو اس سے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں بات آگے بڑھتی اور مزید نکھرتی ہے، اور پھر بلاشبہ یہ ایک کار ثواب اور نیک عمل بھی ہے اگر اس کے انجام دینے میں دینی و اخلاقی حدود کو ملحوظ رکھا جائے، مثلاً (۱) اس میں مقصود نہ کسی کی بے جا حمایت کرنا ہو اور نہ بیجا مخالفت کرنا بلکہ مقصود احقاق حق اور ابطال باطل اور حقیقت حال اور صداقت کا تعین اور رضائے الٰہی کا حصول ہو (۲)۔ اور یہ کہ اس میں جو بات کہی جائے علمی سنجیدگی و متانت اور واضح دلائل کے ساتھ کہی جائے جذباتی اور ادعائی انداز نہ اختیار کیا جائے کیونکہ اس سے فائدہ کم اور ضرر و نقصان زیادہ ہوا کرتا ہے اور سلجھنے کی بجائے بات الجھ کر رہ جاتی ہے (۳)۔ اور یہ کہ دوسرے کی جس تحریر پر تنقید و اعتراض کرنا ہو پہلے اسے پوری توجہ اور غوروفکر کے ساتھ از اول تا آخر پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس میں اپنے ذاتی مزعومات و مفروضات کو دخیل نہ ہونے دیا جائے، اگر وہ تحریر مفصل، منظم اور مرتب ہے تو اس کے کسی ایک حصے اور ٹکڑے کا ایسا مطلب نہ لیا جائے جو تحریر کے باقی حصوں سے مطابقت نہ رکھتا ہو کیونکہ ایسے خود ساختہ مطلب کی بنا پر پوری تحریر پر جو تنقید ہوگی وہ عقلاً بھی درست نہ ہوگی، یہ اس لئے کہ صاحب تحریر کا صحیح مطلب وہ ہوتا ہے جو پوری تحریر سے جوڑ کھاتا اور مطابقت رکھتا ہے، غرضیکہ کسی کے مضمون و مقالے یا کتاب کے صرف بعض حصوں کو سرسری طور پر پڑھ کر بلا سوچے سمجھے یا اس کے بعض حصوں کو اپنے پاس سے من مانے معنی پہنا کر اس پر تنقید اور اس کی تردید کرنا کسی لحاظ سے درست رویہ نہیں (۴)۔ اور یہ کہ جب کسی کے مضمون و مقالے کی تردید اور تغلیط کرنی ہو تو سب سے پہلے اس بات کی کی جائے جو اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصل مقصد اور مرکز کی حیثیت رکھتی ہے اس کے بعد ان باتوں کو لیا جائے جو ضمنی ، ذیلی اور ثانوی حیثیت رکھتی ھیں تردید کا یہی معقول طریقه ہے ، اصل اور مرکزی بات کو چھوڑ کر ضمنی و ذیلی باتوں کی بحث میں الجھنا کوئی معقول علمی طریقه نہیں اس سے خواہ مخواہ الجھاؤ بڑھتا اور مطلوبه مقصد حاصل نہیں ھوتا ۔

(۵) تبصرہ و تنقید کرنے والے کیلئے سب سے ضروری امر یہ ہے کہ جس مسئله سے متعلق وہ دوسرے کی تحریر پر تبصرہ و تنقید کرنا چاھتا ہے اس مسئله کے متعلق اس کا علم دوسرے سے زیادہ بھی ھونا چاھیئے اور بہتر بھی تاکه وہ صحیح گرفت کر سکے ، یعنی جو دوسرے کے برابر بھی علم نه رکھتا ھو اسے حق نہیں پہنچتا که وہ دوسرے پر قلم اٹھائے اور فضول باتیں لکھ کر اپنا وقت بھی ضائع کرے اور دوسرے کا وقت بھی ضائع کرے ، بعض دفعه ایسا ھوتا ہے که ایک شخص کو اپنے زیر بحث مسئله سے متعلق واجبی حد تک بھی علم نہیں ھوتا لیکن اسے چونکه الٹا سیدھا لکھنے کی کچھ مشق اور عادت ھوتی ہے لہذا عادت سے مجبور ھو کر اس پر قلم اٹھاتا اور ایسی باتیں لکھ دیتا ہے جو اس کی کم علمی اور کج فہمی کا بھانڈہ پھوڑ دیتی ھیں، دوسرے کو رسوا کرنے کی بجائے خود رسوا ھو جاتا ہے (٦) ـ چونکه اسلام کی یہ تعلیم ہے که اذا قلتم فاعدلوا الآیة جب تم کچھ کہو تو اس میں عدل کا لحاظ رکھو ـ لہذا ایک مسلمان پر لازم ھوتا ہے که وہ کسی حال میں بھی عدل و انصاف کا دامن ھاتھ سے نه چھوڑے ـ بنابریں جب کسی مسئله سے متعلق کسی کی تحریر پر بحث و گفتگو کرنی ھو تو ایسا انداز اختیار کیا جائے جو عدل و انصاف کے مطابق ھو جس انداز بحث و گفتگو کو وہ اپنے لئے اچھا نہیں سمجھتا اسے دوسرے کے لئے بھی اچھا نه سمجھے اور اس سے بچے اور دور رھے ـ

(۷) اسی طرح اسلام کی یہ بھی تعلیم ہے که ھر مسلمان دوسرے مسلمان کے متعلق حسن ظن رکھے اور سوء ظن سے بچے لہذا کسی مسلمان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسرے سے کسی مسئلہ پر اختلاف رائے میں ایسی بات کہے جو سوء ظن و بدگمانی پر مبنی ہو۔

غرضیکہ مذکورہ امور کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی کا دوسرے کی کسی تحریر سے اختلاف اور اس پر تنقید کرنا برا نہیں بلکہ شرعاً ایک اچھا و مستحسن امر ہے لہذا فراخدلی اور خوشدلی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔

اب میں محترم جناب محمد اکرم خان کے اس تبصرے کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے از راہ کرم میرے مضمون پر فرمایا ہے، ایسے ہی دو کرم وہ مجھ پر پہلے بھی فرما چکے ہیں جن کے جوابات ماہنامہ حکمت قرآن کے مارچ اور اگست ۱۹۸۴ء کے شماروں میں ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ کہ میں نے اپنے مضمون کے ابتدائی دو تین صفحوں میں واضح طور پر عرض کیا ہے کہ اس مضمون میں میرا اصل مقصد، معاملہ اجارہ کی شرعی حیثیت کا تعین کرنا ہے یعنی یہ کہ اس کی شرعی حیثیت واجب کی ہے یا مستحب کی ہے یا حرام کی ہے یا مکروہ کی ہے یا مباح کی ہے، اور یہ اس لئے کہ ائمہ علم اصول الفقہ نے تمام شرعی احکام کو مذکورہ پانچ اقسام میں تقسیم کیا ہے لہذا کسی معاملہ اور مسئلہ کے متعلق کوئی شرعی حکم ایسا نہیں ہو سکتا جو مذکورہ پانچ حیثیات میں سے کسی ایک حیثیت کا حامل نہ ہو۔ اور پھر دوسرے صفحہ پر یہ بھی بتلایا ہے کہ یہ مضمون میں نے بعض اچھے تعلیم یافتہ حضرات کے اس سوال کے جواب میں لکھا کہ اجارے کا معاملہ بھی ربوٰ کی طرح کا معاملہ ہے جس طرح معاملہ ربوٰ میں قرض خواہ کے لئے اس کا اصل مال بھی محفوظ رہتا ہے اور وہ اس فائدے کے عوض جو مقروض نے اس کے مال سے اٹھایا مقروض سے کچھ زائد مال بطور سود وصول کرتا ہے، اسی طرح معاملۂ اجارہ میں کرائے کی چیز بھی اس کے مالک کے لئے محفوظ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رھتی ہے اور وہ اس فائدے کے عوض جو کرایہ دار نے کرائے کی چیز سے اٹھایا کچھ مال بطور کرایہ وصول کرتا ہے دونوں معاملوں میں زائد مال کے عوض کوئی حقیقی مستقل بالذات شئ موجود نہیں ھوتی ، نیز جو مفاسد معاملۂ ربوٰ سے ظہور میں آتے ھیں وھی مفاسد معاملۂ اجارہ سے بھی وجود میں آتے ھیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام میں معاملۂ ربوٰ قطعی حرام و ناجائز اور معاملہ اجارہ حلال و جائز ہے ، مثلاً ایک شخص بنک وغیرہ کو ایک لاکھ روپے قرض دے کر اس سے بطور سود ایک ھزار روپے ماھانہ لیتا ہے تو آپ کہتے ھیں کہ یہ ربوٰ اور قطعاً حرام ہے اور جب وھی شخص ایک لاکھ روپے کا مکان خرید کر دوسرے کو کرائے پر دیتا اور ھر ماہ ایک ھزار روپے بطور کرایہ وصول کرتا ہے تو آپ فرماتے ھیں کہ یہ بالکل جائز اور حلال ہے حالانکہ عملی حقیقت اور معروضی نتائج کے لحاظ سے ان کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا ، بھرحال عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں معاملوں کا حکم ایک سا ھو یا دونوں حرام و ناجائز ھوں یا دونوں حلال و جائز، ایک کو حرام اور دوسرے کو حلال کہنا سمجھ میں نہیں آتا ، اور پھر چونکہ معاملۂ ربوٰ کا حرام ھونا نص قطعی سے ثابت ہے لھذا اسے کوئی حلال نہیں کہہ سکتا ، تو اب سوال صرف اجارے کے متعلق رہ جاتا ہے کہ اس کے حلال و جائز ھونے کے قرآن و حدیث میں کیا دلائل ھیں اور ان دلائل سے اسکی جو شرعی حیثیت متعین ھوتی ہے وہ کیا ہے ؟ میں نے اپنے اس مفصل مضمون میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے ، اگر کسی کے نزدیک میرا یہ جواب صحیح نہیں تو اسے چاھیئے کہ وہ اس کا دوسرا جواب پیش کرے جو صحیح ھو ۔

میں نے اپنے جواب میں اجارہ کی شرعی حیثیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے علم اصول الفقہ کی روشنی و راھنمائی میں لکھا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لہذا اس کے صحیح و غلط اور خطاء و صواب کا اندازہ وهی شخص کر سکتا ہے جو علم اصول الفقه سے آگاهی رکھتا ہو ، کتب اصول الفقه میں واجب ، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام کی جو تعریفیں لکھی ھیں ان کے مطابق اجارے کا معاملہ صرف مکروہ کی تعریف میں آتا ہے واجب ، مستحب ، مباح اور حرام کی تعریف میں نہیں آتا ، اس کی پوری تفصیل میرے مضمون میں مذکور ہے ، اگر کسی عالم کو میری تحقیق اور رائے سے اتفاق نہ ہو بلکہ اختلاف ہو تو اس کا صحیح مثبت طریقہ یہ ہے کہ وہ اصول الفقه ھی کے دلائل سے یہ ثابت کرے کہ معاملۂ اجارہ کی شرعی حیثیت ، مکروہ کی نہیں بلکہ مستحب وغیرہ کی ہے۔ پھر چونکہ معاملہ اجارہ کی شرعی حیثیت کے متعلق میری رائے دراصل اس علم و فہم پر مبنی ہے کہ قرآن و حدیث میں جزوی صراحت کے ساتھ کوئی ایسی نص مذکور نہیں جو اس معاملہ اجارہ کے جواز یا عدم جواز پر صریح الدلالت ہو ، لہذا میری رائے کو مسترد کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ قرآن مجید سے کوئی ایسی آیت یا کتب حدیث سے کوئی ایسی قولی، فعلی ، تقریری صحیح حدیث پیش کر دی جائے جس سے اس معاملہ کا جواز بمعنے استحباب ثابت ہوتا ہو تو اس سے میری رائے خود بخود مسترد ہو جائے گی ۔ اسی طرح میں نے اپنے علم و فہم کے مطابق عام معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق جو اصولی اور کلی تصور قرآن مجید سے سمجھا اور اس سے معاملہ اجارہ کے شرعی حکم کا استنباط کیا ہے اگر کوئی صاحب علم دلائل سے اس کو غلط ثابت کرکے قرآن مجید سے کوئی دوسرا اصولی و کلی تصور پیش کر دے جس سے اس معاملہ کا جواز مع الاستحباب ثابت ہوتا ہو تو اس سے بھی میری رائے غلط و مردود قرار پائے گی لیکن یہ کام درحقیقت هر اهل علم کے بس کا نہیں بلکہ اس کو صرف ایسا عالم دین کر سکتا ہے جو قرآن و حدیث کا وسیع اور گہرا علم رکھتا اور اس نظام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکروعمل اور ضابطہ رشد و ھدایت کو ہر پہلو سے اچھی طرح جانتا ہو جو حیات انسانی سے متعلق قرآن و حدیث میں پایا جاتا ہے نیز جو علم اصول الفقہ سے اچھی واقفیت کے ساتھ۔ استنباط و استخراج کی اعلیٰ صلاحیت سے بھی آراستہ ہو ۔۔

اب اس تنقیدی اور تردیدی تبصرہ کو دیکھیئے جو جناب محمد اکرم خان نے میرے مضمون پر فرمایا ہے اس میں کہیں قرآن و حدیث کے حوالے اور اصول الفقہ کے وسیلے سے آپ کو ایسی بات نہیں نظر آئے گی جس سے میرے مضمون کے اصل مقصد اور مرکزی مدعا کی نفی اور تردید ہوتی ہو ، اس میں جو قیل و قال اور ردوقدح کی گئی ہے اس کا زیادہ تر تعلق ان امور سے ہے جن کا میرے مضمون میں ضمنی طور پر ذکر ہے ، گویا اصل مقصد سے توجہ ہٹانے کے لئے ضمنی و ذیلی بحثوں میں الجھنے الجھانے کی فضول کوشش کی گئی ہے اور اس میں علمی طریقہ سے مثبت دلائل سے کام لینے کی بجائے مناظرانہ طریقہ سے منفی دلائل اور الزامی سوالات سے کام لیا گیا ہے اور اس میں تعلی اور گھمنڈ کا رنگ نمایاں ہے ، مثلاً صفحہ دو پر لکھا ہے :

,,ہماری مجموعی رائے یہ ہے کہ بنیادی اسلامی مأخذ کی روشنی میں جناب مصنف نے جو رائے قائم کی ہے وہ درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس سے بہت سی عملی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ، مزید براں بہت سے معاملات پر ان کی رائے کی حیثیت ایک موضوعی رائے سے زیادہ نہیں جس کو معروضی دلائل سے ثابت کرنا محال ہے،، ۔

اس عبارت کا پہلا لفظ ہماری بجائے میری اس پر دلالت کرتا ہے کہ تبصرہ نگار صاحب علم و فضل کے بلند مقام پر فائز اور دینی مسائل میں ان کی رائے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے ، لیکن اس سے آگے موصوف نے جو فرمایا وہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا ، ان کا یہ فرمانا کہ بنیادی اسلامی مآخذ کی روشنی میں جناب مصنف نے جو رائے قائم کی ہے وہ درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس سے بہت سی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عملی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ، چونکہ ان کے اس فرمان کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں ۔ ایک یہ کہ وہ رائے بنیادی اسلامی مأخذ قرآن و حدیث اور کتاب و سنت کے مطابق نہیں بلکہ مخالف ہے اور اس سے عملی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں لہٰذا درست معلوم نہیں ہوتی ، دوم یہ کہ وہ رائے قرآن و حدیث کے مطابق تو ہے لیکن چونکہ اس سے عملی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں لہٰذا صحیح معلوم نہیں ہوتی ، اگر پہلا مطلب ہے تو بتلانا پڑے گا کہ وہ رائے قرآن مجید کی کس آیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس حدیث کے مخالف ہے کہ اس سے اس رائے کی نفی ہوتی ہے محض کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا ، اور اگر دوسرا مطلب ہے تو بتلانا پڑے گا کہ اگر کسی مسئلہ کے متعلق صحیح اسلامی رائے کے لئے فقط یہی کافی نہیں کہ وہ قرآن و حدیث کے مطابق ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس سے عملی پیچیدگیاں نہ پیدا ہوتی ہوں ، قرآن و حدیث سے اس کا ثبوت کیا ہے جبکہ شروع سے لے کر اب تک تمام فقہاء و علماء کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ کسی رائے اور بات کے صحیح اسلامی ہونے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اسلامی بنیادی مأخذ یعنی قرآن و حدیث کے مطابق ہے اس کے سوا اور کسی چیز کو اس کی صحت و عدم صحت کا معیار قرار دینا درست نہیں ۔ لہٰذا کسی اسلامی قانون کی صحت و عدم صحت کا معیار اس چیز کو بنانا کہ اس سے عملی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں یا نہیں عقل اور تجربے کی رو سے بھی غلط ہے اس لئے کہ عملی پیچیدگیاں دراصل قانون سے نہیں بلکہ اس ذہنی اور خارجی ماحول سے پیدا ہوتی ہیں جس کے اندر قانون عملاً نافذ کیا جاتا ہے اگر وہ ذہنی و خارجی ماحول قانون کے موافق اور سازگار ہوتا ہے تو اس میں قانون کے نفاذ سے کوئی مشکل اور پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی اور اگر ناموافق و ناسازگار ہوتا ہے تو قانون کے عملی نفاذ سے ضرور عملی مشکلات اور پیچیدگیاں ظہور میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آتی ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام ہر قانون کے نفاذ سے پہلے معاشرے میں ایسی ذہنی اور خارجی فضا پیدا کرنے کی ہدایت و تاکید کرتا ہے جو اس کے قیام اور بقا کے موافق و سازگار ہوتی اور جس کی موجودگی کی وجہ سے مخالف رد عمل کا ظہور نہیں ہوتا دراصل یہ وہ حکمت عملی ہے جسے اسلام نے اپنے قوانین کے نفاذ میں پوری طرح ملحوظ و مدنظر رکھا ہے اور مسلمانوں پر لازم ٹھہرایا ہے کہ وہ قوانین کے عملی نفاذ میں ہمیشہ اس حکمت عملی کو سامنے رکھیں اور اس کے مطابق قوانین کا نفاذ عمل میں لائیں ، مثال کے طور پر تحریم ربوٰ کے قانون کو دیکھیئے جہاں تک ربوٰ کے حرام ہونے کا تعلق تھا ظلم پر مبنی ہونے کی وجہ سے روز اول سے حرام تھی لیکن قانونی طور پر اس کا عملی نفاذ ۹ ہجری میں کیا گیا جب اس کے لئے موافق و سازگار ذہنی اور خارجی حالات پیدا ہو گئے اور مخالف رد عمل کے ظہور کا اندیشہ نہ رہا ۔

اور پھر کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ جن ملکوں اور معاشروں میں سرمایۂ دارانہ نظام قائم و رائج ہے وہ سود کے بغیر چل ہی نہیں سکتا ان میں جب سود کے حرام و ممنوع ہونے کا مسئلہ اٹھتا ہے تو ماہرین معاشیات یہی بات کہتے ہیں کہ اس سے بے شمار عملی پیچیدگیاں اور دشواریاں پیدا ہوں گی تو کیا اس سے یہ سمجھنا درست ہوگا کہ اسلام میں تحریم ربوٰ کا جو قانون ہے وہ صحیح نہیں ، ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے لئے ایسا سمجھنا درست نہیں ہو سکتا تو پھر اجارے کے متعلق جو شرعی قانون ہے اسے اس وجہ سے نادرست کہنا کہ اس سے عملی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

دراصل یہاں دو الگ الگ مسئلے ہیں : ایک اجارے کے متعلق شرعی قانون کے تعین کا مسئلہ جو ایک علمی و نظری مسئلہ ہے اور جس کے حل کا تمامتر دارومدار صرف قرآن و حدیث کی ہدایت پر ہے جو شریعت کا حقیقی مأخذ ہیں ، لہذا اس کے تعین میں صرف یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا فرمایا گیا ہے ۔ چنانچہ اس لحاظ سے بحث و استدلال کا وہ طریقہ جو کسی معاملہ کے متعلق شرعی حکم اور قانون کے تعین کے لئے اختیار کیا جاتا ہے موضوعی طریقہ ہے جس میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جا سکتی جو شارع کے وضع کردہ اصول وضوابط سے تعلق اور مطابقت نہ رکھتی ہو ، معروضی طریقہ نہیں جو آزاد ہوتا اور کسی چیز اور بات کی اچھائی و برائی کا تعین معروضی حالات کی روشنی میں کرتا ہے لہذا کہہ سکتے ہیں کہ معروضی طرز فکر دینی طرز فکر نہیں ، اور دوسرا مسئلہ اجارے کے متعلق شرعی قانون کے عملی نفاذ کا مسئلہ ہے جو نظری سے زیادہ عملی مسئلہ ہے اس کے متعلق اسلام کی جو حکمت عملی ہے وہ یہ کہ جب تک اجتماعی طور پر وہ مطلوبہ ذہنی اور خارجی حالات موجود نہ ہوں جو اس قانون کے کامل عملی نفاذ کے لئے ضروری ہیں تو پھر جیسے حالات موجود ہوں ان کے مطابق اس قانون کا نفاذ عمل میں لایا جائے یعنی اس کو ایسی شکل میں نافذ کیا جائے جو ان خاص حالات میں قابل قبول اور قابل عمل ہو اور جس کے نفاذ سے مخالف رد عمل کے ظہور کا اندیشہ نہ ہو جس کا نتیجہ ہمیشہ حاصل شدہ فائدہ کے مقابلہ میں نقصان کہیں زیادہ ہوا کرتا ہے نیز جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں حالات کے نسبۃً کچھ بہتر ہو جانے کی توقع ہو ، البتہ یہ رعایت اسلام ، ایسے مسلم معاشرے کو دیتا ہے جس کا اصل مقصد اور نصب العین ، اس شرعی قانون کو بالآخر اس کی اصل اور کامل شکل میں بروئے کار لانا ہو اور وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ ایسے حالات پیدا کرنے کی امکانی کوشش بھی کر رہا ہو جو اس قانون کے کامل طور پر عمل میں آنے اور پائیداری کے ساتھ قائم رہنے کے لئے ضروری ہیں ، چنانچہ اس حکمت عملی کے ساتھ اصلاح معاشرہ کا کام ہو تو اس سے معاشرے کو نقصان بھی نہیں ہوتا اور اسے خیر و خوبی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ اپنے آئیڈیل اور اصل منزل مقصود کی طرف برابر آگے بڑھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔

نفس قانون اور نفاذ قانون کے درمیان فرق کے متعلق جو تفصیل عرض کی گئی ہے میں سمجھتا ہوں اگر یہ تفصیل فاضل تبصرہ نگار کے سامنے ہوتی تو وہ اپنے تبصرہ میں ان خدشات کا اظہار نہ کرتے جن کا انہوں نے میرے مضمون پر تبصرے میں کیا ہے۔

جناب اکرم خان نے میرے مضمون پر تبصرے میں زیادہ تر ایسی باتوں پر بحث و تنقید کی ہے جو میرے مضمون میں ضمناً اور بطور توضیح اور تائید کے ذکر ہوئی ہیں مثلاً ان میں سے ایک بات اسلام کے آئیڈیل مثالی معاشرے کی بات تھی میں نے لکھا کہ معاملہ اجارہ دلائل کی رو سے ایسے معاملات میں آتا ہے جو شرعاً جائز تو ہوتے ہیں لیکن کراہت کے ساتھ یعنی جن کا نہ کرنا کرنے سے بہتر ہوتا ہے اور یہ کہ ایسے معاملات دراصل عبوری دور سے تعلق رکھتے اور اس وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک کہ معاشرے میں وہ ذہنی اور خارجی حالات پیدا نہیں ہو جاتے جو اسلام چاہتا ہے اسلام کے آئیڈیل و مثالی معاشرے میں اس قسم کے معاملات کے لئے کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اس کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ کہ اس میں ہر فرد کو تمام بنیادی ضروریات میسر ہوتی ہیں جن کے بغیر عام طور پر ایک انسان اپنی طبعی عمر تک سکون و اطمینان کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی ضروریات میں سے ایک ضرورت رہائشی مکان کی بھی ہے، دوسری خصوصیت یہ کہ اس میں ہر شخص اپنی ضرورت سے زائد چیز اپنی نہیں بلکہ اس دوسرے کی سمجھتا ہے جس کے پاس وہ چیز نہیں ہوتی، تیسری خصوصیت یہ کہ اس میں کوئی فرد مجبوری کے تحت دوسرے سے معاملہ نہیں کرتا اور نہ کوئی کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، اس میں کامل عدل و احسان کا دور دورہ ہوتا ہے لہذا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے میں ضرورت کی اشیاء کرائے پر دینے لینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ مطلب یہ کہ جہاں مثلاً ہر انسان کے پاس اپنا مکان موجود ہو اور جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد مکان ہو وہ اسے اپنا نہیں بلکہ اس کا سمجھتا ہو جو اس کا ضرورتمند ہے وہاں مکان کرائے پر دینے لینے کا احتمال ہی نہیں رہتا ۔

میری اس بات پر جناب اکرم خان صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے :

,, لیکن کیا یہ بات خلاف واقعہ نہیں کہ ایسا اسلامی معاشرہ اس وقت دنیا میں کہیں نہیں ہے بلکہ انسانی تاریخ میں کبھی کوئی ایسا دور طلوع نہیں ہوا جہاں ایسا ہوا ہو " ۔ (ص ١١٥) .

اس سوال کا جواب یہ کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ آج دنیا میں جتنے بھی نام نہاد اسلامی ممالک و معاشرے ہیں ان میں سے کسی کے اندر بھی عملی طور پر نہ اسلام کا وہ معاشرتی و معاشی نظام موجود ہے اور نہ سیاسی و ثقافتی نظام جو قرآن و حدیث میں بیان ہوا ہے اکثر مسلم معاشروں میں جو معاشی نظام پایا جاتا ہے وہ اصولی طور پر سرمایۂ دارانہ ہے ۔ جو تجارتی نوعیت کے قرضوں پر سود کو جائز قرار دیتا ہے ۔ بعض ممالک میں اشتراکی نوعیت کا اور بعض میں مخلوط قسم کا معاشی نظام ہے تو کیا اس کا یہ مطلب لینا درست ہوگا کہ چونکہ آج دنیا میں کہیں بھی اسلام کا معاشی ، معاشرتی ، سیاسی اور ثقافتی نظام عملی طور پر موجود نہیں لہذا آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اسلام کے اجتماعی نظام کی بات ہی نہیں کرنی چاہیئے ، اگر یہ مطلب لینا اکرم خان کے نزدیک درست نہیں تو پھر ان کا یہ مطلب لینا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ آج چونکہ کہیں ایسا اسلامی معاشرہ موجود نہیں جس میں مذکورہ خصوصیات پائی جاتی ہوں اور جس میں مکان وغیرہ کرائے پر دینے کا رواج نہ ہو لہذا اسلام کے مثالی معاشرے کا مذکورہ تصور غلط اور معاملہ کرایۂ کے مکروہ ہونے کی بات نادرست ہے ، غرضیکہ کسی چیز کا عملاً موجود نہ ہونا، اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے غلط اور باطل ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا اور آئیڈیل تو ہوتا ہی وہی ہے جو پوری طرح اور کامل طور پر عمل میں نہ آسکتا ہو ورنہ اس کا آئیڈیل ہونا ختم ہو جاتا ہے اور وہ ایک ماڈل اور عملی نمونہ بن جاتا ہے ، لہذا یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی اسلامی معاشرہ خواہ کتنی ہی کوشش کرے اسلام کے آئیڈیل معاشرے کے مطابق نہیں بن سکتا لیکن اس کا مقصد اور نصب العین یہی ہونا چاہیئے کہ وہ اس کے مطابق بنے چنانچہ جو معاشرہ جتنا اس کے مطابق بنتا ہے اتنا ہی وہ اچھا اور بہتر معاشرہ قرار پاتا ہے ۔ اس لحاظ سے چونکہ عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ کا اسلامی معاشرہ عملاً اس آئیڈیل اور مثالی معاشرے کے ممکن حد تک مطابق اور انتہائی قریب تر تھا ، لہذا وہ ان سب معاشروں سے بہتر اور افضل تھا جو بعد میں اب تک ظہور میں آئے ، پھر جب کسی معاشرے کے متعلق کوئی بات کہی جاتی ہے تو اس سے مراد اس کے افراد کی بڑی اکثریت ہوتی ہے سو فیصد افراد نہیں ہوتے بنا بریں ایک اچھے معاشرے کا مصداق وہ معاشرہ قرار پاتا ہے جس کے افراد کی عظیم اکثریت اچھی اور برا معاشرہ وہ قرار پاتا ہے جس کی بڑی اکثریت بری ہوتی ہے اور چونکہ یہ واقعہ ہے کہ عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ کے اسلامی معاشرے کی بہت بڑی اکثریت اپنے سچے و پکے ایمان کی وجہ سے اعلیٰ سیرت و کردار کی مالک اور ان اسلامی صفات اور اخلاقی اوصاف سے آراستہ تھی جن سے اللہ تعالی ایک مسلمان کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے ہر شخص دوسرے کے ساتھ نہ صرف یہ کہ عدل بلکہ احسان اور ایثار کا سلوک کرتا اور ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی رکھتا تھا ، ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانا اور ضرر سے بچانا ہر ایک کا مقصد تھا رزق حلال کے لئے ہر شخص جدوجہد اور محنت و مشقت کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتا اور اس نیت سے مال کماتا تھا کہ اپنی ، اپنے اہل و عیال ، پڑوسیوں اور دیگر محتاجوں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورتمندوں کی معاشی کفالت کرے نہ یہ کہ مال و دولت جمع کرکرکے بڑے سے بڑا مالدار اور دولتمند بنے اور دوسروں پر اپنی مالی برتری جتلائے ، نتیجہ یہ کہ گو سادہ سے سادہ شکل میں سہی لیکن ہر ایک کو بنیادی معاشی ضروریات میسر تھیں ، ایسے معاملات تقریباً مفقود ہو گئے تھے جن میں ایک فریق بغیر کسی محنت و مشقت کے محض اپنے محفوظ سرمائے کی وجہ سے نفع کے طور پر کسی مادی چیز کا حقدار ٹھہرتا ہے ربوٰ اور ربوٰ سے مشابہ تمام معاشی معاملات ختم ہو گئے مکان وغیرہ کرائے پر دینے لینے کی کوئی مثال نہیں ملتی ، مضاربت تک ختم ہو گئی تھی بعض مستند کتابوں میں لکھا ہے کہ پہلے اسلامی معاشرے میں تحریم ربوٰ کے بعد مضاربت کی دو مثالیں ملتی ہیں جو غور سے دیکھا جائے تو وہ بھی مضاربت کی بجائے کوئی اور معاملہ نظر آتی ہیں ، غرضیکہ عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں ایک ایسا اسلامی معاشرہ ضرور سامنے آیا جس کے اندر حرام معاملات ہی نہیں مکروہ معاملات بھی ختم ہو گئے تھے لہذا محمد اکرم خان کا یہ لکھنا کہ ,, انسانی تاریخ میں کوئی ایسا دور طلوع نہیں ہوا جس میں ایسا ہوا ہو ،، کم علمی و ناسمجھی پر مبنی اور قطعاً غلط ہے متوازن ذہن کا آدمی کبھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا ، کون ہے جس کا علم پوری انسانی تاریخ پر حاوی اور محیط ہو لہذا پوری انسانی تاریخ کے حوالہ سے کوئی دعوی کرنا عقلاً بھی درست نہیں ہو سکتا ۔

اور پھر جو چیز پہلے اسلامی معاشرے میں ظہور پذیر ہوئی اس کا بعد کے کسی اسلامی معاشرے میں ظہور پذیر ہونا ، نہ عقلاً ناممکن ہے اور نہ محال ، ایک فرد بحیثیت انسان کے جو عمل کر سکتا ہے دوسرا بھی بحیثیت انسان کے وہ عمل ضرور کر سکتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے نہیں کرتا ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور پھر چونکہ مسلمانوں کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے صحابہؓ کی سنت پر عمل کرنا ممکن ہے لہذا وہ اس کے مکلف ھیں کہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کی زندگی کے مطابق بنانے کی ہر ممکن اور حتی الوسع کوشش کریں جو مکروہ قسم کے معاشی معاملات پہلے اسلامی معاشرے میں مفقود و ناپید ھو گئے تھے ان کو اپنے معاشرے سے ختم کرنے کی پوری کوشش کریں ، اس کے مکلف نہیں کہ ان کی کوشش سو فیصد کامیاب ھو کیونکہ اس کا دار و مدار حالات کی سازگاری و ناسازگاری پر ہے ، لیبیا کی حکومت نے اپنے علماء کے مشورے سے یہ طے کیا کہ تمام شہریوں کو رھائش کے لئے اپنے مکان میسر ھوں اور کرائے پر لینے دینے کا معاملہ ختم ھو اور اس کا یہ طے کرنا منشائے اسلام کے عین مطابق تھا اور پھر اس سلسلہ میں اس نے جو کوشش کی وہ خاصی حد تک کامیاب رھی ، اس کو بالکل ناکام کہنا امریکہ اور امریکہ کے نمک خواروں اور سرمایہ داروں کا پروپیگنڈہ ہے میں جو کہہ رھا ھوں چشم دید گواھوں کی شہادت پر کہہ رھا ھوں ، لیبیا میں جو معاشی نظام ہے وہ مارکسی اور شیوعی معاشی نظام نہیں بلکہ اسلامی اشتراکی نظام ہے کیونکہ وہ ذرائع پیداوار کی انفرادی و شخصی ملکیت کا قائل اور اس پر مبنی ہے ، لیبیا کا نظام تعلیم ، ایمانی عقائد اور اسلامی اقدار کا پوری طرح آئینہ دار اور عام قانونی نظام فقہ مالکی کے مطابق ہے اللہ ان لوگوں کو ھدایت دے جو لیبیا کو روس وغیرہ کمیونسٹ ممالک کی طرح کا ایک ملک سمجھتے اور اس کے خلاف پروپیگنڈہ میں سرگرم عمل ھیں ۔

میرے مضمون میں مرکزی نقطہ قرآن و حدیث کی روشنی میں اجارہ بمعنے کرایۂ داری کی شرعی حیثیت کا تعین تھا ، اس پر بحث کے ضمن میں بطور مثال لیبیا کا ذکر آیا جو ان اطلاعات پر مبنی تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو مؤثق ذرائع سے مجھے ملیں ضروری نہیں کہ وہ سو فیصد درست ہوں ، لیبیا کے ذکر سے میرا مقصد یہ کہ ایسا ہونا ممکن ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کے پاس اپنے معاشی وسائل کے مطابق ذاتی مکان ہو اور یہ کہ حکومت ایسے حالات پیدا کر سکتی ہے کہ کوئی شہری اپنی اس بنیادی ضرورت سے محروم نہ رہے اور رفتہ رفتہ مکانوں کی کرایہ داری کا مسئلہ ختم ہو جائے ، آخر سوشلسٹ ممالک نے بھی بہت بڑی حد تک اس مسئلہ کو اپنے طریقہ سے حل کر دیا ہے جناب اکرم خان بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں ، مسلمان معاشرے چاہیں تو اپنے طریقہ سے اس کو حل کر سکتے ہیں لیکن برا ہو اس ذہنیت کا جو اپنی کم علمی اور کج فہمی کی بنا پر اس طرح کے مکروہ معاملات کو منشائے اسلام کے مطابق سمجھتی اور ان کو اسلام کے نام پر ہمیشہ قائم رکھنا چاہتی ہے ایسے حضرات اسلام کے دشمن تو نہیں لیکن نادان دوست ضرور ہیں ۔

میں نے اپنے مضمون میں (ص ۹۰) پر لکھا ہے کہ ,, اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہر انسان کے پاس اپنا مکان ہو کیونکہ وہ غذا اور لباس کی طرح ہر انسان کا بنیادی حق تسلیم کرتا اور حکومت اسلامی پر لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت شہریوں کی بنیادی معاشی ضروریات کا بندوبست کرے ،، ۔

اس پر اعتراض کرتے ہوئے اکرم خان نے (ص ۱۱۶) پر تحریر فرمایا : ,, مولینا محترم کی یہ رائے کہ اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ ہر شخص کو مکان فراہم کرے محل نظر ہے اس موقف کی تائید میں قرآن و سنت سے سند فراہم کرنا ضروری ہے ،، ۔

قارئین فکرونظر کی خدمت میں گزارش ہے کہ پہلے یہ دیکھیں کہ میری مذکورہ عبارت سے جناب اکرم صاحب نے جو رائے نکالی اور میری طرف منسوب کی ہے کیا یہ درست ہے اور کیا یہ کج فہمی اور علمی بددیانتی کی بدترین مثال نہیں ، میری عبارت سے کہاں یہ رائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکلتی ہے کہ حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ وہ ہر شخص کو مکان فراہم کرے ، کیا ,, باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت شہریوں کی بنیادی معاشی ضروریات کا بندوبست کرنے کا مطلب ہر شخص کو غذا ، لباس اور مکان فراہم کرنا ہے ؟ ہر لکھا پڑھا سمجھدار آدمی یہ جانتا ہے کہ بندوبست اور انتظام کرنے کا مطلب اور ہے اور فراہم و مہیا کرنے کا مطلب اور ، اسلام ، اسلامی حکومت کا یہ فریضہ نہیں قرار دیتا کہ وہ ہر شہری کو پکا پکایا کھانا ، سلا سلایا تیار لباس اور بنا بنایا مکان فراہم کرے ، بلکہ وہ اس پر یہ لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن کے اندر ہر ضرورتمند شہری کو اس کی بنیادی ضروریات میسر آ سکتی ہوں جو لوگ معاش کے سلسلہ میں کوئی مفید کام کر سکتے ہوں ان کے لئے مواقع کار مہیا کرے ، اجرت پر کام کرنے والوں کے لئے اجرتوں کا ایسا نظام بنائے جس میں معمولی سے معمولی کام کی یومیہ مقدار کی اتنی اجرت ضرور ہو جس سے اجیر کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں یعنی گو سادہ سے سادہ شکل اور معمولی سے معمولی معیار پر سہی لیکن اسے غذا ، لباس اور مکان ضرور میسر آسکے ، اگر حکومت کی تحویل میں ایسی زمین ہو جس پر رھائشی مکانات بن سکتے ہوں اس میں سے ایسے لوگوں کو مفت یا معمولی معاوضہ کے ساتھ مناسب پلاٹ مہیا کرے جن کے پاس مکان نہ ہوں ، اسی طرح مکانات کے لئے جس تعمیری مواد اور سازوسامان کی ضرورت ہوتی ہے ملک کے اندر اس کے کارخانے لگوائے مثلاً سیمنٹ اور سریا وغیرہ کے ، امداد باھمی کی ایسی انجمنیں بنائے جو باھمی تعاون اور اشتراک عمل سے مکانات کے مسئلہ کو حل کریں جیسا کہ اشتراکی چین میں ہوتا ہے ، اسی طرح حکومت مکانات بنانے کے لئے افراد معاشرہ کے درمیان قرضہ حسنہ دینے لینے کا بندوبست اور انتظام کر سکتی ہے ، غرضیکہ اسلام کی رو سے اسلامی حکومت پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے وہ یہ نہیں کہ وہ ملکی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور قومی دولت اور وسائل دولت پر قبضہ کرکے اس سے شہریوں کی بنیادی ضروریات پوری کرے جن کے پاس رہائشی مکانات نہ ہوں ان کو قومی بیت المال کے خرچہ پر مفت بنا کر دے بلکہ اس کی ذمہ داری صرف یہ کہ عدل اسلامی کے دائرہ کے اندر ایسے عملی اقدامات کرے اور طور طریقے عمل میں لائے جن سے افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات عزت نفس ، خود داری اور آزادی کے ساتھ پوری ہو سکتی ہوں اور ہر انسان کے بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہو کیونکہ اسلام کی رو سے حکومت کے وجود کا اصل مقصد ہی تمام شہریوں کے ہر قسم کے حقوق کا تحفظ اور معاشرے میں عدل و قسط کا قیام ہے۔

اور چونکہ ایک حدیث نبوی کے مطابق ہر آدمی کا بحیثیت آدمی کے یہ حق ہے کہ اس کے پاس رہنے کے لئے مکان ، پہننے کے لئے لباس اور کھانے پینے کیلئے روٹی پانی ہو وہ حدیث میں نے اپنے مضمون کے صفحہ بہتر (۷۲) پر نقل بھی کی ہے اللہ جانے اکرم خان کو کیوں نظر نہیں آئی ، اس طرح ہے: لیس لابن آدم حق سوی ثلاث: بیت یکنہ و ثوب یواریہ عورتہ وجلف الخبز و الماء ـ ہر آدمی کا یہ حق ہے کہ اس کے پاس سر چھپانے کے لئے گھر ، ستر ڈھانپنے کیلئے کپڑا ، کھانے پینے کیلئے روٹی اور پانی ہو ، لہذا اسلامی حکومت کا یہ فریضہ قرار پاتا ہے کہ مذکورہ بالا طور طریقوں سے تمام شہریوں کے اس حق کا تحفظ کرے اور ایسے عملی قدم اٹھائے جن کے ذریعہ حق مذکور کا تحفظ ہو سکتا ہو۔

جناب محمد اکرم صاحب کی تحریروں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور اس کے حقیقی مأخذ قرآن و حدیث کے متعلق موصوف کا علم نہایت ادھورا اور سطحی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کا اندازہ تحریر یہ بتلاتا ہے کہ وہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمجھتے ہیں دوسرا کوئی نہیں سمجھتا ، نیز ان کی تنقید کا اسلوب تعمیری و ایجابی سے کہیں زیادہ تخریبی و منفی ہے بنانے کی بجائے بگاڑنے میں ان کو مزہ آتا ہے دوسرے کی سیدھی صاف بات کو فوراً محل نظر بنا دیتے ہیں ۔

علاوہ ازیں افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ معاشی افکار و نظریات کی تاریخ سے بھی خاص واقفیت نہیں رکھتے ورنہ وہ میرے مضمون پر اپنے تبصرے میں (ج) کے تحت (ص ۱۱۶) پر یہ ہرگز نہ لکھتے کہ محنت و سرمائے کے متعلق یہ تصور پہلے پہل کارل مارکس نے پیش کیا ہے کیونکہ کارل مارکس سے صدیوں پہلے ایسے مفکرین کے نام ملتے ہیں جنھوں نے اس تصور کو پیش کیا اور اس کی تائید میں لکھا مثلاً یونانی حکماء میں سے افلاطون نے سرمائے کو کڑک مرغی سے تشبیہہ دے کر یہ ظاہر کیا کہ سرمایہ کسی مال و دولت کو جنم نہیں دیتا ، کارل مارکس سے پہلے یورپ وغیرہ میں کئی ایسے معاشی مفکر گزرے جو اس تصور کے قائل اور داعی تھے مثلاً ایڈم اسمتھ جسے باوائے معاشیات کہا جاتا ہے اسی تصور کا علمبردار تھا ، مسلمان مفکرین میں علامہ ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب المقدمہ میں اس تصور کو نہایت واضح الفاظ میں لکھا حالانکہ وہ کارل مارکس سے تقریباً پانچ سو سال پہلے گزرے ، اس بارے میں مقدمہ ابن خلدون کی چند عبارات پیش کی جاتی ہیں ۔

,, الاعمال ھی سبب الکسب ،، انسانی اعمال ھی کمائی کا سبب ہیں (ص ۳٦۵) ,, کثرۃ الاعمال سبب للثروۃ ،، معاشی کاموں کی کثرت دولتمندی کا سبب ہے (۳٦۵) ,,ان المکاسب انما ھی قیم الاعمال ،، کمائیاں سوائے اس کے نہیں کہ وہ انسانی اعمال کی قیمتیں ہیں (۳٦۰) ,, ان الکسب ھو قیمۃ الاعمال البشریۃ ،، ۔ بے شک کمائی تو صرف انسانی کاموں کی قیمت ہے (۳۸۰) ,, الرزق والکسب انما ھو قیم اعمال اھل العمران ،، (۲۸۹) ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان عبارات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ علامہ ابن خلدون کے نزدیک انسانی کام و محنت ھی وہ چیز ہے جس سے کوئی دولت و ثروت وجود میں آتی ہے۔

لیکن واضح رھے کہ میں اس تصور کا اس لئے قائل نہیں کہ مذکورہ حضرات اس کے قائل تھے بلکہ اس لئے قائل ھوں کہ میں نے اس پر برسوں سوچا اور غوروفکر کیا ہے بے لاگ مشاھدے اور تجربے کی روشنی میں بھی اور قرآن حکیم کی بعض آیات کی راھنمائی میں بھی اور اس آئیڈیل معاشی نظام کے نقطہ نظر سے بھی جسے اسلام اپنے مجوزہ مثالی معاشرے میں بروئے کار دیکھنا چاھتا ہے اور پھر طویل مطالعے اور غور و فکر کے بعد میں جس نتیجہ تک پہنچا ھوں اسے قطعی طور پر صحیح اور حق سمجھتا ھوں اس کے خلاف جو دلائل پیش کئے جاتے ھیں وہ مغالطے اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں ، میں اپنے بعض مضامین میں اس پر خاصی تفصیل سے لکھ چکا ھوں۔

دراصل عوامل پیدائش دولت کا مسئلہ ھر معاشی نظام میں بنیادی اھمیت رکھتا ہے تقسیم دولت کے متعلق ھر معاشی نظام میں جو مخصوص قانونی ضابطہ اور عملی ڈھانچہ ہوتا ہے غور سے دیکھا جائے تو اس کا اس تصور سے گہرا تعلق ہوتا ہے جو وہ عوامل پیدائش دولت کے بارے میں رکھتا ہے ، مثلاً سرمایۂ دارانہ نظام یہ تصور رکھتا ہے کہ عوامل پیدائش دولت بنیادی طور پر دو ھیں ایک لیبر یعنی دماغی و جسمانی محنت اور دوم کیپیٹل یعنی سرمایہ خواہ وہ کسی شکل میں بھی ھو ، مطلب یہ کہ کسی معاشی کاروبار میں بطور نفع جو دولت حاصل ہوتی ہے وہ محنت اور سرمائے دونوں کے عمل سے پیدا شدہ ہوتی ہے اور دونوں کا اس میں حصہ ہوتا ہے لہذا اگر کسی کاروبار میں ایک کا کسی شکل میں سرمایۂ اور دوسرے کا کام و عمل تھا تو دونوں کو پیدا شدہ دولت میں سے حصہ ملنا چاھیئے یعنی وہ پیدا شدہ دولت دونوں کے درمیان تقسیم ہونا ضروری ہے ، نتیجہ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

که عوامل پیدائش کے متعلق مذکورہ تصور کی وجہ سے نظام سرمایۂ داری میں کاروبار اور معاشی معاملات کی وہ سب شکلیں قانونی طور پر جائز قرار پاتی ھیں جن میں ایک کا کسی نہ کسی شکل میں محفوظ سرمایہ ھوتا اور دوسرے فریق کا دماغی جسمانی معاشی کام و عمل ھوتا اور حاصل ھونے والے نفع میں دونوں حسب معاھدہ حقدار قرار پاتے ھیں حتیٰ کہ تجارتی نوعیت کے قرضوں پر سود کا لین دین بھی قانوناً جائز ٹھہرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نظام سرمایۂ داری کے ماننے والے کبھی اس پر بحث نہیں کرتے کہ نفس سود جائز ہے یا ناجائز؛ بلکہ وہ اگر بحث کرتے ھیں تو اس پر کہ کن حالات میں اس کی شرح کتنی ھونی چاھیئے کیونکہ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ سرمایہ بھی دولت کو پیدا کرتا ہے عقلاً اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں رھتی کہ پیدا آور مقاصد کے قرضوں پر سود کا لینا دینا جائز ہے یا نہیں ، اس کے بالمقابل سوشلسٹ اور اشتراکی نظام کا عوامل پیدائش دولت کے متعلق یہ تصور ہے کہ دولت جو کچھ بھی پیدا ھوتی ہے محنت اور صرف محنت سے پیدا ھوتی ہے لھذا اس کا تمامتر حقدار صرف محنت کش ھوتا ہے، چنانچہ اس تصور کی بنا پر اشتراکی نظام میں کاروبار اور معاملات کی مذکورہ بالا سب شکلیں قانوناً ناجائز و ممنوع قرار پاتی ھیں جن میں ایک فریق بغیر کسی محنت و مشقت کے صرف اپنے اس سرمائے کی بنا پر جس کے تحفظ کی ضمانت موجود ھوتی ہے کسی زائد مال کا حقدار ٹھہرتا ہے، یہاں یہ سوال پیدا ھوتا ہے کہ عوامل پیداوار کے متعلق اسلام کا تصور کیا ہے جسے اس نے اپنے معاشی نظام میں تقسیم دولت کے متعلق ملحوظ رکھا ہے ؟ پھر چونکہ مذکورہ دو تصوروں کے علاوہ تیسرا کوئی تصور اس بارے میں ممکن نہیں لھذا علماء اسلام کے ذمے اس کا تعین ضروری ہے کہ مذکورہ دو تصوروں میں سے کونسا تصور اسلام کی رو سے صحیح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور کونسا غلط ؟ کیونکہ اس کے بغیر اسلام کے معاشی نظام کی عملی صورت کا کبھی تعین نہیں ہو سکتا ۔

عوامل پیدائش دولت کے متعلق اسلام کا تصور کیا ہے ؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہمارے متقدمین اور متأخرین فقہاء کرام کے سامنے نہ تھا یہ مسئلہ کچھ ہی زمانہ پہلے اس وقت وجود میں آیا جب بحیثیت ایک علم کے علم المعاشیات کی تدوین ہوئی اور اس کے مختلف اجزاء ترکیبی کو علمی طریقہ سے مرتب کیا گیا اور باقاعدہ ایک نظام کی شکل دی گئی اور اسے پڑھنے پڑھانے کے لئے دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں باقاعدہ شعبے قائم ہوئے اور سیکولر انداز سے علم المعیشت (اکنامکس) کے متعلق بے شمار کتابیں لکھی گئیں اور معاشیات کے متعلق مختلف مکاتب فکر سامنے آئے اور مسئلہ مذکور کے بارے میں مختلف آراء قائم ہوئیں ، غرضیکہ اگر یہ مسئلہ تدوین فقہ کے مختلف ادوار میں ہمارے فقہاء کرام کے سامنے ہوتا تو وہ اس کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں ضرور کوئی رائے پیش کرتے ، چونکہ نہیں تھا لہذا معتمد علیہا کتب فقہ میں اس کے متعلق کوئی بحث اور راہنمائی نہیں ملتی تو پھر ظاہر ہے کہ اس مسئلہ سے متعلق اسلامی تصور متعین اور پیش کرنے کی ذمہ داری عصر حاضر کے ایسے علماء پر عائد ہوتی ہے جو قرآن و حدیث کے وسیع و عمیق علم کے ساتھ جدید معاشیات اور اس کے مختلف مکاتب فکر سے بھی ایک حد تک واقفیت و آگاہی رکھتے نیز حقیقت پسندی اور استنباط و استخراج کی صلاحیت سے آراستہ ہوں کیونکہ یہ کام ان لوگوں کے بس کا نہیں جو محض رسمی قسم کا نصابی اور کتابی علم رکھتے ہیں ۔

دراصل اس قسم کے جدید مسائل حل کرنے کا زیادہ صحیح اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ محقق قسم کے علماء کی ایک جماعت ایسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسائل کو اجتماعی غوروفکر اور باہمی بحث و مذاکرے اور تبادلۂ خیالات کے ذریعے حل کرنے کی مجتہدانہ کوشش کرے لیکن بدقسمتی سے چونکہ ہمارے ہاں کوئی ایسی جماعت موجود نہیں لہذا مجبوراً انفرادی علم و فہم اور غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے ، بہرحال میں نے اپنی علمی و فکری بساط کے مطابق مسئلہ مذکورہ پر بھر پور طریقہ سے پڑھا اور غور وفکر کیا اور جس نتیجہ تک پہنچا اس کو میں نے اپنے بعض مضامین میں دلائل و شواہد کے ساتھ خاصی تفصیل سے پیش کیا ، واضح رہے کہ میں اشتراکی اور سرمایۂ دارانہ دونوں نظاموں کو کل اور مجموعے کی حیثیت سے باطل نظام یقین کرتا ہوں لیکن ان کے ہر ہر جزء اور ہر ہر تصور کو غلط اور باطل نہیں گردانتا کیونکہ جس نظام اور کل کی ہر ہر جزء باطل ہو وہ ایک منٹ بھی قائم نہیں رہ سکتا اور ان دو نظاموں کا قائم رہنا گو ایک خاص وقت تک سہی اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے اندر باطل کے عنصر کے ساتھ کچھ حق کا عنصر بھی موجود ہے جو انہیں قائم رکھے ہوئے ہے مثلاً نظام سرمایۂ داری میں انفرادی و شخصی ملکیت کا تصور جس کی رو سے کوئی شخص اشیاء صرف کی طرح ذرائع پیداوار کا بھی مالک قرار پا سکتا ہے ایک صحیح اور حق تصور ہے کیونکہ قرآن و حدیث کے ہدایت کردہ تصور ملکیت کے مطابق ہے ، اسی طرح محنت اور سرمائے کے عامل پیداوار ہونے کے متعلق اشتراکیت کا جو تصور ہے وہ صحیح اور حق ہے گویا اسلام سے لیا گیا ہے جس نے ربوٰ کی ہر شکل کو قطعاً حرام ٹھہرایا ، غرضیکہ کسی نظام کے ایک باطل تصور کی وجہ سے اس کے تمام تصورات کو باطل اور غلط سمجھنا ، دین اور عقل دونوں کے خلاف ہے لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو جہل اور تعصب کی بنا پر اشتراکیت کی طرف منسوب کسی بات کو بھی صحیح اور حق نہیں سمجھتے اور ایسے لوگ بھی جو نظام سرمایۂ داری کی ہر بات کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلط و باطل کہتے ہیں گویا کہ وہ اپنی اس روش سے اسلام کی خدمت کر رہے اور اسے فائدہ پہنچا رہے ہیں ، اللہ تعالیٰ اسلام کو ایسے نادان دوستوں سے بچائے جن سے دانا دشمن اچھے ، بلاشک اسلام کو جتنا نقصان اس کے نادان دوستوں سے پہنچا ہے اتنا دانا دشمنوں سے نہیں پہنچا ، بہرحال مذکورہ روش حق اور انصاف کے خلاف اور قطعاً غیر اسلامی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں کچھ اہل علم حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلام کا معاشی نظام بنیادی طور پر سرمایۂ دارانہ معاشی نظام ہے ، سرمایۂ دارانہ نظام میں زکاۃ کا اضافہ کر دیا اور بنکوں کے سود کی نفی کر دی جائے تو وہ اسلامی معاشی نظام بن جاتا ہے چنانچہ یہ حضرات سرمایۂ کاری کی ان تمام شکلوں کو جو نظام سرمایۂ داری میں رائج ہیں سوائے مروجہ بنکاری کے جائز سمجھتے اور اس میں صرف بعض فروعی و سطحی تبدیلیوں اور ظاہری لیپاپوتی کے قائل ہیں اسی وجہ سے پاکستان میں مروجہ سرمایۂ دارانہ اور جاگیر دارانہ معاشی نظام کو اسلامی بنانے کے لئے ان کی زبان اور قلم کا پورا زور مذکورہ دو چیزوں پر ہی صرف ہو رہا ہے ، اس سلسلہ میں حکومت کی سطح پر جو اقدامات کئے گئے ہیں چونکہ ان کے کچھ زیادہ اچھے اثرات و نتائج سامنے نہیں آئے لہذا ان حضرات میں سے بعض کی طرف سے ایسی تجاویز سامنے آرہی ہیں جو ان کے سابقہ موقف سے ہٹی ہوئی اور خاصی مختلف ہیں ، میں سمجھتا ہوں آئندہ ایسے حالات اور تجربات رونما ہوں گے جو ان کو اسلام کے معاشی نظام کے متعلق اپنا موجودہ موقف تبدیل کرنے پر مجبور کریں گے اور وہ بڑا مبارک وقت ہوگا ۔

ادھر مجھ جیسے لوگ جو اپنے علم و فہم کے مطابق پوری ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کا معاشی نظام ، بنیادی اور جوہری طور پر سرمایۂ دارانہ نظام اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشتراکی نظام دونوں سے مختلف نظام ہے لہذا اوپر کے بعض جزوی اور سطحی رد و بدل اور لیپاپوتی سے نہ سرمایۂ دارانہ نظام اسلامی نظام بن سکتا ہے اور نہ اشتراکی نظام اسلامی نظام قرار پا سکتا ہے یہ الگ اور دوسری بات ہے کہ ایک پہلو سے سرمایۂ دارانہ نظام اور دوسرے پہلو سے شیوعی نظام ، اسلامی نظام سے جزوی مشابہت و مطابقت رکھتا ہے۔

اسلامی معاشی نظام کے متعلق اختلاف مذکور کا لازمی نتیجہ وہ اختلافات ہیں جو بعض جزوی معاشی مسائل کے اسلامی حل کے متعلق ہمارے اور ان حضرات کے مابین پائے جاتے ہیں جو اسلام کے معاشی نظام کو بنیادی طور پر سرمایۂ دارانہ معاشی نظام سمجھتے ہیں ، اجارے کے متعلق میرے مضمون پر تبصرے میں اکرم خان صاحب نے جو تنقید اور قیل و قال فرمائی ہے غور سے دیکھا جائے تو اس کا مقصد اپنے اس موقف کا تحفظ و دفاع نظر آتا ہے جو اسلام کے معاشی نظام کے متعلق ان کے حلقے میں پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ اسلامی معاشی نظام بنیادی اور اصولی طور پر سرمایۂ دارانہ معاشی نظام ہے ، یہ حضرات اپنے خود ساختہ موقف کے خلاف کسی بات کو ماننا تو درکنار اسے سننا اور پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے اور کبھی پڑھتے ہیں تو صرف اس لئے کہ اسے رد کیا جائے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کیڑے نکالتے ، بدیہی کو نظری بناتے ، بعض دفعہ اس بات کا ایسا مطلب لیتے ہیں جو کہنے والے کے وہم و خیال میں بھی نہیں ہوتا اور پھر اس کی تردید کرنے لگتے ہیں اور اس میں جائز اور ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے گویا کہ اس بارے میں ان کے لئے اسلام کی کوئی ہدایت ہی نہیں جس کی پابندی کی جانی چاہیئے ، مثبت و تعمیری تنقید اور منفی و تخریبی تنقید میں جو فرق ہے اس کا کوئی لحاظ اور خیال نہیں رکھتے کیونکہ ان کا اصل مقصد ہر طریقہ سے اس بات کا رد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا ہوتا ہے جس سے ان کے موقف کو نقصان پہنچتا اور دھچکا لگتا ہے۔

اجارے کی شرعی حیثیت کے متعلق میں نے قرآن و حدیث اور اصول الفقہ کی روشنی میں جو بات لکھی ہے کہ وہ جائز تو ہے لیکن سخت کراھیت کے ساتھ۔ اور یہ کہ اس کا نہ کرنا کرنے سے بہتر ہے یعنی اگرچہ حرام نہیں لیکن مکروہ و مشتبہ ضرور ہے یہ بات چونکہ اس موقف سے مطابقت نہیں رکھتی جو اجارے کے متعلق محمد اکرم خان وغیرہ کا ہے لہذا تبصرے کے عنوان سے اسے رد اور کنڈم کرنے کی کوشش فرمائی گئی ہے اور اس میں کئی ایسے اعتراضات اٹھائے گئے هیں جن کا جواب میرے مضمون میں موجود ہے گویا کہ توجہ کے ساتھ پورا پڑھنے کی بھی توفیق نصیب نہیں ہوئی یا ان کی سمجھ ھی میں نہیں آیا ، مثلاً میں نے صاف لکھا ہے کہ اجارے کا جو معاملہ میرے زیر بحث ہے اس کی صورت یہ کہ ایک فریق اپنی کوئی نفع بخش شئ دوسرے فریق کو استعمال کرنے اور فائدہ اٹھانے کے لئے دیتا اور یہ طے کرتا ہے کہ نفع اٹھانے کے عوض دوسرا اس کو وقت یعنی دن ، مہینے یا سال کے حساب سے اتنا مال وغیرہ ادا کرے گا لہذا اس معاملے میں ایک فریق کی مملوکہ چیز مکان ، فرنیچر اور مشین وغیرہ اس کی تحویل و نگرانی سے نکل کر دوسرے کی تحویل و نگرانی میں چلی جاتی ہے اور وہ عرف کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاتا اور کرائے کی صورت میں اس کا معاوضہ ادا کرتا ہے چنانچہ ظاهر ہے کہ اس میں معاملے کی وہ شکل نہیں آتی جس میں کرائے پر چلائے جانے والی چیز اپنے مالک کی تحویل و نگرانی میں رهتی وہ اپنی جیب سے اس کے جملہ اخراجات اٹھاتا ، اس کے ساتھ خود کام کرتا ، اس سے دوسروں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیتا اور اس کا معاوضہ لیتا ہے ، اس کی چھوٹی مثال ایک ٹیکسی سے دی جا سکتی ہے جسے اس کا ملک خود چلاتا ، اپنی جیب سے پٹرول وغیرہ پر خرچ کرتا اسے اپنی تحویل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و نگرانی میں رکھتا اور لوگوں کو سواری کا موقع دے کر ان سے کرائے کے نام پر معاوضہ لیتا ہے ، اور بڑی مثال ریلوں ، بسوں ہوائی اور بحری جہازوں سے دی جا سکتی ہے جن کو بڑی بڑی ٹرانسپورٹ کمپنیاں چلاتی ھیں وہ ان چیزوں کو اپنی تحویل اور دیکھ بھال میں رکھتی ، ان کو چلانے کے لئے پٹرول ، ڈیزل اور کوئلہ وغیرہ کے اخراجات اٹھاتیں ، ہزاروں باتنخواہ ملازمین سے کام لیتی ھیں اور مسافروں کو بالمعاوضہ سواری کی سہولتیں فراھم کرتی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ھیں کئی ملکوں میں ٹرانسپورٹ کا یہ نظام قومی ملکیت اور حکومت کی تحویل و نگرانی میں ھوتا ہے اور اس سے منافع حاصل کرنے کی بجائے اس میں خسارے برداشت کیا جاتا ہے۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اجارے اور کرائے کا وہ معاملہ جس میں کرائے کی شئے کرایۂ دار کی تحویل میں دے دی جاتی اور وہ اس کی نگرانی کا ذمہ دار ھوتا ہے اور وہ معاملہ جس میں کرائے کی چیز مالک کی تحویل میں رھتی اور وہ اس کو چلانے کے لئے دماغی جسمانی محنت و مشقت بھی کرتا اور مالی اخراجات بھی اٹھاتا ہے اپنی ساخت اور ھیئت ترکیبی اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف معاملے ھیں لہذا ان کا شرعی حکم بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے ، اول الذکر معاملے میں مکان وغیرہ کا مالک ؛ کرایۂ دار سے بطور کرایۂ جو مال وغیرہ لیتا ہے وہ صرف اس منفعت کا عوض ھوتا ہے جو کرایۂ دار مکان وغیرہ سے اٹھاتا ہے جبکہ ثانی الذکر معاملے میں مثلاً ٹیکسی کا مالک سواریوں سے جو لیتا ہے اس کے عوض اس کی طرف سے محنت و مشقت بھی ھوتی ہے اور پٹرول وغیرہ پر خرچ کیا ھوا مال بھی ، دراصل اس صورت میں ٹیکسی وغیرہ کی حیثیت ان آلات و اوزار کی سی ھوتی ہے جن کے ساتھ کام کرکے کوئی ھنرمند کاریگر کماتا کھاتا ہے ، دوسری مثال لیجیئے ایک شخص کے پاس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلائی مشین ہے جب اس کے ساتھ وہ خود دوسروں کے کپڑے سیتا اور اجرت لیتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ اس درزی کے کام و ہنر کی اجرت ہے اس میں مشین کی کارکردگی اور گھسائی کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا ، بخلاف اس صورت کے کہ جب وہ شخص اس مشین کے ساتھ خود کوئی کام نہیں کرتا بلکہ کسی درزی کو استعمال کے لئے دیتا اور اس سے یومیہ مثلاً دس روپے بطور کرایۂ لیتا ہے اس صورت میں مشین اس کے مالک کے لئے کاریگر کے آلے کی طرح نہیں ہوتی اور یہ کہ اس صورت میں اس کیلئے اتنا کرایہ لیناتو یقیناً جائز ہو سکتا ہے جتنی استعمال ہونے سے مشین کی قیمت و مالیت میں کمی واقع ہوتی ہے اس سے زائد لینے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہوتا ، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ یہ ایک نظری بات ہے جس پر عمل کرنے کے لئے خاص طرح کا ذہنی و خارجی ماحول موجود ہونا ضروری ہے جو آج ہمارے نام نہاد مسلم ملکوں و معاشروں میں موجود نہیں ، مسلمان ممالک میں عام طور پر جو نظام سرمایۂ داری و جاگیرداری رائج اور اس کے تحت جس طرح کے حالات پائے جاتے ہیں ان میں مذکورہ نظرئیے پر عمل تو درکنار اس کا زبانی ذکر بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا کیونکہ اس میں سرمایۂ دار یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اپنا سرمایہ کسی کو برتنے اور استعمال کرنے کے لئے دے اور اس کا کوئی معاوضہ نہ لے ، لیکن اسلام اپنی ایمانی اور احسانی تعلیمات کے ذریعے اس ذہنیت کو مٹانے اور ایثار و احسان کے جذبات پیدا کرنے کے بعد اپنے ماننے والوں کو ایسے معاملات پر عمل کرنے کی ہدایت و تعلیم دیتاً ہے جن میں سرمائے والا فریق بغیر کسی دماغی جسمانی سعی و محنت کے محض اپنے اس سرمائے کی بنا پر کسی زائد مال کا مستحق نہیں قرار پاتا جس کے تحفظ کی ضمانت بھی موجود ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

هاں تو اوپر اصل بات یہ ہو رہی تھی کہ اجارے و کرائے کی وہ شکل جو ٹرانسپورٹ سے تعلق رکھتی ہے ہمارے زیر بحث اجارے میں نہیں آتی کیونکہ اس میں گاڑی وغیرہ اپنے مالک کے قبضہ و تصرف میں رہتی خواہ وہ مالک فرد ہو یا جماعت اور وہ اس کے ساتھ خود کام محنت کرتا اور اس کے اخراجات کا بوجھ اٹھاتا اور پسنجروں کو سفر کی سہولتیں فراہم کرتا اور اس کے بدلے ان سے اجرت و معاوضہ لیتا ہے ، دراصل اجارے کی یہ شکل اس اجارے کی تعریف میں آتی ہے جو بلا کسی کراهیت کے جائز بلکہ مستحب ہے اس کے جواز کا ثبوت قرآن مجید سے صراحةً ملتا ہے سورۃ الکھف میں حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے قصے کے اندر مذکور ہے کہ مسکین ملاحوں کی ایک کشتی تھی جسے وہ دریا میں چلا کر اس کے کرائے پر گزارہ کرتے تھے وہ آیت اس طرح ہے :

اما السفینة فکانت لمساکین یعملون فی البحر الآیة

(لیکن وہ کشتی کچھ مسکین ملاحوں کی تھی جس کے ساتھ وہ دریا میں کام کرتے اور روزی کماتے تھے) ۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کشتی رانی اور ملاحت کا پیشہ بالکل جائز اور اس کے ذریعے روزی کمانا کھانا حلال ہے اس آیت میں اگرچہ بظاہر بحری ٹرانسپورٹ کا ذکر ہے لیکن اس پر قیاس کے ذریعے بری اور فضائی ٹرانسپورٹ کا بھی جواز فراہم ہوتا ہے ۔

ٹرانسپورٹ کا نظام پرائیویٹ اور نجی ملکیت اور تحویل میں بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی اور قومی ملکیت میں بھی لیکن آج عام طور پر پس ماندہ غیر ترقی یافتہ ممالک کے جو حالات ہیں ان میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ عوامی ٹرانسپورٹ قومی و اجتماعی ملکیت میں ہو اور حکومت اپنی تحویل و نگرانی میں اسے کمرشل بنیاد پر اور نفع کمانے کے مقصد سے نہیں بلکہ رفاہ عام اور خدمت خلق کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارادے سے چلائے ، عامة الناس سے صرف اتنا کرایه وصول کرے جو اس کے جمله اخراجات کے لئے ضروری ہو ، آج دنیا میں بہت سی ایسی حکومتیں ہیں جو اندرون ملک ٹرانسپورٹ کے نظام کو اسی طریقه سے چلاتی اور صرف اتنے کرائے مقرر کرتی ہیں جو اخراجات کے برابر ہوتے ہیں بعض ملکوں میں حکومتیں اس شعبه میں خساره برداشت کرتی ہیں ـ

ٹرانسپورٹ کے متعلق میں نے مذکوره باتیں اس لئے عرض کی ہیں که جناب اکرم خان صاحب نے میرے مضمون پر اپنے عالمانه تبصرے میں اس کا خاص طور پر ذکر کیا ہے دیکھیئے (صفحه ۱۱۷) پر (د) کا پیرا گراف ـ موصوف نے اس میں جس پریشانی کا اظہار کیا ہے میرے مذکوره معروضات سے دور ہو جانی چاہیئے یه دوسری بات ہے که وه میرے معروضات کو انصاف اور حق پسندی کے ساتھ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی نه کریں تو اس کا کوئی علاج نہیں ، نه ماننے والوں کے لئے کوئی دلیل خواه وه کتنی ہی قوی اور واضح کیوں نه ہو سودمند اور کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی ـ

میں یه محسوس کرتا ہوں که میری یه جوابی تحریر خاصی طویل ہوگئی لیکن کیا کیا جائے اس کے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نه تھا کسی کی تحریر و تقریر پر اعتراض کرنا جتنا آسان ہوتا ہے اس اعتراض کا جواب دینا اتنا آسان نہیں ہوتا غلط فہمی پھیلانا آسان لیکن اسے دور کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے ـ

ختم کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں که اکرم خان صاحب نے اپنے تبصرے کے آخر میں ,, خلاصه کلام ،، کے ذیل میں جو لکھا ہے اس کا موصوف کو ضرور جواب دوں کیونکه اس میں اچھی خاصی جہالت اور حماقت کا مظاہره فرمایا گیا ہے بلکه ایک ایسے رویے کا جو ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہو سکتا ، بہرحال مناسب ہوگا که خلاصه کلام میں جو لکھا گیا ہے پہلے اس کو نقل کیا اور پھر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جواب لکھا جائے ، ان کی عبارت یہ ہے : ,, آخر میں ہم اتنا عرض کریں گے کہ مولینا محمد طاسین کا یہ موقف کہ اثاثہ جات کا کرایہ مکروہ تحریمی ہے نہ تو عقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی انسانی تاریخی شواہد سے ، مولانا نے بلا ارادہ اشتراکیت کے معاشی مسلک کو اسلام سے پیوند کرنے کی کوشش کی ہے " ۔

اس کے جواب میں پہلی بات یہ کہ ہر عالم دین یہ جانتا ہے کہ مکروہ تحریمی ، ایک شرعی اصطلاح ہے جس کا مفہوم و مطلب علم اصول الفقہ میں بیان کیا گیا اور جس کے ثبوت کا تمامتر دار و مدار شرعی دلائل پر ہے نہ عقلی دلائل پر ہے اور نہ تاریخی شواہد پر ، اور یہ کہ شرعی دلائل کا مأخذ قرآن و حدیث ہے ، میں نے مکان وغیرہ کے اجارے کی ایسی استحصالی شکلوں کو جن میں مالک مکان کرایہ دار کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کمی سے کہیں زیادہ لیتا ہے جو استعمال ہونے سے مکان وغیرہ کی مالیت اور قیمت میں واقع ہوتی ہے ، بلاشک مکروہ تحریمی لکھا ہے یعنی جائز تو ہے لیکن سخت کراہیت کے ساتھ ، اور جو لکھا ہے قرآن و حدیث کی روشنی اور اصول الفقہ کی راہنمائی میں لکھا ہے طویل و عمیق مطالعے اور امکانی غوروفکر کے بعد لکھا ہے جس کا بین ثبوت خود میرا وہ مضمون ہے جو فکرونظر کے بہتر صفحات میں پھیلا ہوا ہے ، اس میں میں نے اجارے کی شرعی حیثیت کا تعین شرعی دلائل کی بنا پر کیا ہے ، اب جس کو مجھ سے اختلاف اور جو میرے پیش کردہ شرعی دلائل کو کمزور اور غلط سمجھتا ہو اس پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اپنے دوسرے شرعی دلائل سے یہ ثابت کرے کہ زیر بحث اجارے کی شرعی حیثیت مکروہ کی نہیں بلکہ واجب اور مستحب کی ہے لیکن بجائے اس کے اکرم خان کا یہ لکھنا ,, کہ اجارے کا مکروہ تحریمی ہونا نہ عقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی تاریخی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شواہد سے "، بڑی عجیب اور مضحکہ خیز بات ہے اس کا مطلب یہ کہ موصوف کے نزدیک کسی عمل و معاملے کی شرعی حیثیت کا تعین قرآن و حدیث کے شرعی دلائل سے نہیں بلکہ عقلی دلائل اور تاریخی شواہد سے ہونا ضروری ہے اور یہ ایسی بات ہے جسے کوئی عالم دین صحیح نہیں کہہ سکتا ، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ پڑھتے ، سوچتے سمجھتے کم اور لکھتے زیادہ ہیں ان سے ایسی نادانی کی غلط باتیں ضرور سرزد ہوتی ہیں ، اسلام کی یہ تعلیم ہے جو شخص کسی چیز کو نہ جانتا ہو اس کے متعلق بحث و مباحثہ سے بچے اور گریز کرے ۔

اور پھر جناب اکرم صاحب سے یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ جناب کے نزدیک عقلی دلائل کا وہ مطلب کیا ہے جسے ہر ذی عقل مانتا اور صحیح سمجھتا ہو ؟ اور پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ عقلی دلائل صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی ، مثلاً دین و مذہب کو ماننے والے بھی عقلی دلائل کا سہارا لیتے ہیں اور اس کا انکار کرنے والے دھریے بھی اپنی تائید میں عقلی دلائل ہی پیش کرتے ہیں اور ہر ایک اپنے عقلی دلائل کو صحیح اور دوسرے کے عقلی دلائل کو غلط کہتا ہے تو پھر بتلایا جائے کہ عقلی دلائل کی صحت و عدم صحت کے جانچنے پرکھنے کا معیار کیا ہے ؟ نیز اکرم صاحب سے یہ بھی دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے قرآن و حدیث میں جو شرعی دلائل ہیں وہ عقل سلیم کے مطابق ہیں یا نہیں ؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر یہ بتلائیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی امر و معاملے کی شرعی حیثیت کو متعین کرنے کے لئے الگ عقلی دلائل کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے ؟ اور اگر جواب یہ ہو کہ شرعی دلائل عقل کے مطابق نہیں تو بتلائیے ایسے جواب اور جواب دینے والے کے بارے میں کیا کہا جائے گا ؟ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذکورہ غلط بات کے بعد اکرم صاحب نے جو یہ لکھا ہے : ,, کہ مولینا نے بلا ارادہ اشتراکیت کے معاشی مسلک کو اسلام سے پیوند کرنے کی کوشش کی ہے " ۔ جہل مرکب کا مصداق ہے یعنی نہ جاننے کے باوجود یہ سمجھنا کہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا اس عبارت میں قطعیت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ اجارے کے متعلق مولینا نے جو لکھا ہے وہ اسلام کے مطابق نہیں بلکہ اشتراکیت کے مطابق ہے لہذا غلط ہے غلط بات بلا ارادہ کہی جائے یا بالارادہ بہرحال غلط ھی رہتی ہے ، میرے متعلق ایسی بات کہنے اور لکھنے کا جواز صرف اس شخص کے لئے ہو سکتا ہے جس نے قرآن و حدیث کے دوسرے شرعی دلائل سے یہ ثابت کیا ہو کہ اجارے کی شرعی حیثیت مکروہ کی نہیں بلکہ مستحب کی ہے لیکن اکرم خان کی پوری تحریر میں کہیں کسی شرعی دلیل کا کوئی ذکر نہیں جس سے میرے موقف کی نفی اور تردید ہوتی ہو، لہذا مولینا کے متعلق اکرم صاحب کی ہرزہ سرائی نہ عقلاً درست ہے اور نہ شرعاً درست، شائد انکو یہ معلوم نہیں کہ جس مولینا کے متعلق انہوں نے جملہ مذکور لکھا ہے جو تقریباً چالیس سال سے اسلامی علوم پڑھنے پڑھانے ، اسلامی نظام حیات اور اس کے مختلف شعبوں کے متعلق غوروفکر ، سوچ بچار اور تحقیق و ریسرچ میں مصروف و مشغول ہے اللہ نے اپنی رحمت سے اس کے لئے وافر اسباب و وسائل مہیا فرمائے ہیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتا بہت عرصہ پڑھنے سوچنے اور سمجھنے کے بعد قلم اٹھاتا اور لکھتا ہے فیشن کے طور پر اور سستی شہرت کی خاطر نہیں لکھتا اور جو لکھتا ہے دین اسلام کی بھلائی و بہتری اور اللہ کی رضا و خوشنودی کے مقصد سے لکھتا ہے ، اسی طرح اللہ کا کرم ہے کہ وہ مروجہ دینی علوم کے ساتھ عصری افکار و نظریات سے بھی ضروری حد تک آگاھی و واقفیت رکھتا ہے فراخدل اور وسیع النظر اور غیر متعصب ہے کسی کا اندھا مقلد نہیں دین کے معاملہ میں اللہ اور رسول کی بات کو پہلے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مانتا اور پھر اس پر غور کرتا ہے لیکن دوسرے کسی کی بات پر پہلے سوچتا اور پھر مانتا ہے اس کی کسی رائے کو دلیل سے غلط ثابت کیا جائے تو وہ اس سے رجوع کرنے میں خوشی محسوس کرتا اور اس کا اعتراف و اعلان ضروری سمجھتا ہے دراصل یہ سب اللہ رب العزت کا لطف و احسان ہے۔ وما توفیقی الا باللہ .

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com